قرآن حکیم اور مستشرقین

ریاض احمد*

Abstract:

If oriental movement may consider as symbol of antagonism against the endeavors of Islam, their activities were originated with the advent of Islam. The westerns had been expressing malice and hostility from time to time specially against the Prophet Muhammad(PBUH(and generally against Islam. Therefore, the bull and cock stories of orientalists kept on transferring descending from father to son. But, it was the fresh tree of Islam in front of orientalists which roots were spreading far and wide. Its stem was so strong and fruitful.

Orientalists began to stroke on its roots, but despite of continuously stroking on it. They saw it much stronger. They began to detect these resources through which this pure tree was continuously taking food. They found its reality that the peak of the fort of Islam had been erected on the strongest pillars likewise the Holy Quran, Hadith and Seerat-e-Mustafa(PBUH.(They strained every nerve to demolish its pillars, but vain. They regretted on their failure.
I shall briefly describe only one pillar with the reference to above i.e the Holy Quran with counter reference to the efforts about enmity of Islam raised by the orientalists.
Key word: Orientalists.

Key Words: Origin, Life, Death, Creation, Evolution.

استشراق اور مستشرقین کی پوری تاریخ پر ایک عمومی نظر ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تحریک استشراق اپنی حقیقت و ماہیت میں اسلام کے خلاف ہے ہر دور کے (غیر مسلم) مستشرقین کی سرگرمیاں، اپنے علمی تنوع کے باوجود اسلام، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اسلامی تاریخ، اور اسلامی علوم و آداب کے حوالے سے بہر حال معاندانہ رہی ہیں اور مستشرقین کی پوری جماعت میں شامل افراد، اپنی اصل و نسل میں یہودی ہیں یا عیسائی ہیں، اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ اسلام اور یہودیت و عیسائیت کے مابین آویزش کے ساتھ ہی استشراقی جذبہ و فکر کی نمو ہوگئی تھی، تاہم اپنے مخصوص فنی و اصطلاحی معنوں اور اطلاقات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ تحریک استشراق کا باقاعدہ آغاز اور مستشرقین کی علمی و تحقیقی سرگرمیاں بہت بعد میں شروع ہوئیں، شاید یہی وجہ ہے کہ:

* ریسرچ اسکالر، وفاقی اردو یونیورسٹی کراچی برقی پتا: rasiddiqui47@gmail.com
تاریخ موصولہ: ۲۰۱۵/۸/۲۵

(الف):.....استشراق (Orientatism) اور مستشرق (Orientalist) کی اصطلاحیں لغوی اعتبار سے بہت زیادہ قدیم العہد نہیں ہیں، بلکہ انگریزی زبان وادب میں ان کا استعمال اپنے مخصوص اصطلاحی معنوں میں اٹھارویں صدی کے اواخر میں شروع ہوا۔(۱) چنانچہ آکسفورد انگلش ڈکشنری کی تصریحات کے مطابق مذکورہ بالا دونوں الفاظ Orient سے مشتق ہیں۔جس کے معنی شرق یا مشرق یا مشرقی سمت کے ہیں۔ جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے پھر اس سے Oriantal ہے یعنی مشرق جو مغرب کا ضد ہے۔مشرقی کے مفہوم میں وہ متوفن بھی ہے۔ جو مشرقی یعنی ایشیائی یا ان ممالک کا باشندہ ہو، جو بحر روم متوسط اور قدیم رومی سلطنت کے مشرق میں واقع ہیں۔جبکہ (Orientalism) یعنی مشرقیت یا استشراق کے معنی ہوں گے، مشرقیت، مشرقی خصوصیات، مشرقی طرز وادا، اقدار، علوم وآداب اور مشرقی فنون وثقافت وغیرہ سے واقفیت ومہارت اور پھر اس سے (Orientalist) مستشرق بنا ہے۔ اس سے مراد وہ شخص ہوگا جو مشرقی زبانوں، علوم وفنون، آداب وثقافت اور تہذیب وتمدن وغیرہ پر عبور رکھتا ہو یا بقول مولوی عبدالحق صاحب، ماہر مشرقیات ہو۔(۲)

(ب).....عربی، فارسی اور اردو کی قدیم لغات میں استشراق کا اصل مادہ یعنی ش رق تو موجود ہے، لیکن زیر بحث الفاظ یعنی باب استفعال میں اس کے معنی ومفہوم یا بطور فعل ان لغات سے بحث نہیں پائی جاتی (البتہ جدید لغات میں ان کا ذکر موجود ہے) چنانچہ قدیم عربی زبان (لغات) میں اس مادہ کا باب استفعال سرے سے مفقود ہے، جدید لغات میں یا قدیم لغات کے جدید ایڈیشنوں میں البتہ مستشرق اور استشراق کے الفاظ بطور اسم فاعل اور اسم مصدر کے ملتے ہیں، جن کا استعمال مخصوص بھی ہے اور محدود بھی ہے۔

استشراق بطور فعل ان لغات میں بھی مذکور نہیں ہے، عربی یا اردو لٹریچر میں بھی یہ لفظ زیادہ پرانا نہیں ہے۔ درحقیقت مستشرق اور استشراق ترجمہ یا چربہ ہے Orientalist یا Orientalism کا، اہل مغرب نے یہ نام اپنے ان نام نہاد اسکالروں کو دیا جنہوں نے بزعم ان کے مشرقی علوم وفنون، زبان وادب اور تہذیب کو جس میں مذہب بھی آجاتا ہے، اپنی دلچسپی کا موضوع بنایا اور ان کا خصوصی مطالعہ کرکے براہ راست اس سے واقفیت حاصل کی، عربی میں اس کے لیے کوئی لفظ پہلے سے موجود نہیں تھا۔اس لیے جب اس کی ضرورت پیش آئی تو انگریزی کے طرز پر الفاظ وضع کر لیے گئے۔(۳)

تحریک استشراق کو اگر خلاف اسلام سرگرمیوں کی علامت مانا جائے تو یہ امر واقع ہے کہ اس قسم کی سرگرمیوں کا آغاز اور اصل ظہور اسلام کے ساتھ ہی ہوگیا تھا اور باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کرنے سے پہلے بھی اہل مغرب کی طرف سے اسلام کے خلاف بالعموم اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف بالخصوص بغض وعداوت کا اظہار موقع بموقع تاریخ کے مختلف ادوار میں ہوتا رہا، اور وفور جذبات سے سرشار، رومی، بازنطینی، لاطینی، مسیحی اور یہودی روایتیں صدیوں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں، افواہوں کے دوش پر سفر کرتی رہیں اور کبھی کبھار تحریر وتصنیف اور وقائع واسفار کے قالب میں ڈھلتی رہیں اور ان کی اپنی آئندہ نسلوں کا سرمایہ افتخار قرار پائیں، چنانچہ ظہور اسلام کے بعد سے کوئی چار ساڑھے چار سو سال

تک اسلام اور بانی اسلام ﷺ کے حوالے سے ان کی مخالفت اور مخاصمت کا عام انداز یہی رہا، اور اس تمام عرصے میں بلکہ اس کے بعد بھی مغربی دنیا اس قابل نہ ہوسکی کہ حقائق وواقعات کا صحیح ادراک کر سکے اور مسلمانوں کی تاریخ وثقافت کو علم کی روشنی میں جان سکے، اس صورت حال کا بظاہر ایک سبب ان کے دلی جذبات کے علاوہ یہ تھا کہ صحیح معلومات کے لیے اصل اسلامی مآخذ تک رسائی ممکن نہ تھی، پھر تعصب، سنی سنائی باتوں، غلط فہمیوں اور خود ساختہ مفروضات نے انہیں اس قابل ہی نہ رکھا کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی حقیقی تصویر دیکھ سکیں، اس پر مستزاد تصادم وکشمکش کے وہ واقعات تھے جو تاریخ میں بار بار دھرائے گئے۔(۴) خاص طور پر آنے والے زمانے میں صلیبی جنگوں کا سلسلہ دشمنی وعداوت کا ایسا نشانہ ان پر طاری کر گیا ہے جو آج تک نہیں اترا، طویل صلیبی جنگوں میں دنیائے مغرب کی ناکامی سے نہ صرف یہ کہ یورپ کی مشترکہ عسکری قوت پاش پاش ہوگئی بلکہ یہی شکست اس بات کا زبردست محرک بن گئی کہ جنگی محاذ پر پسپا ہونے کے بعد ذہنی وفکری محاذ پر اسلام اور دنیائے اسلام کو زک پہنچائی جائے۔(۵)

اس کی تدبیر اس سے بہتر اور کوئی نہ تھی کہ قرآن، اسلام، اسلامی عقائد، پیغمبر اسلام ﷺ اور اسلامی معاشرہ کو ہدف تنقید بنایا جائے، چنانچہ اس کام کے لیے جذباتی طوفان پہلے سے موجود تھا، پھر لاطینی آبادکار اور مسلم علاقوں سے آئے ہوئے عیسائی اور یہودی، اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو کچھ علم، معلومات رکھتے تھے، وہ کتنی ہی خام وناکارہ سہی ان کے لیے بہر حال مفید طلب تھیں، جن کی مدد سے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی (العیاذ باللہ) ایک نفرت انگیز، کریہہ المنظر اور بھیانک تصویر پیش کی جاسکتی تھی اور سیرت ختم الرسل ﷺ کو افراط وتفریط کے سانچوں میں ڈھال کر محض خیالی اور قیاسی انداز میں پیش کیا جاسکتا تھا، مختصر یہ کہ اس پورے عرصہ میں بحیثیت مجموعی پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں مغرب کے پاس معلومات انتہائی ناقص ومبہم تھیں اور اس خلا کو افسانہ طرازی اور دیومالائی کہانیوں سے پر کیا گیا۔

چونکہ مستشرقین کے سامنے اسلام کا شجرۂ طیبہ تھا، جس کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں، اس کا تنا مضبوط اور شاخیں بارآور تھیں، اربوں انسان اس کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر اس کے شیریں پھلوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے انہوں نے حسد کی آگ میں جلتے ہوئے اس شجرۂ طیبہ کو کاٹ دینے کا تہیہ کرلیا۔

انہوں نے اس کی جڑوں پر وار شروع کر دیئے۔لیکن جب بھی انہوں نے اس کی جڑوں پر تازہ وار کیا انہیں محسوس ہوا کہ یہ پہلے سے مضبوط تر ہوگیا، وہ حیران تھے کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ وہ چیز کیا ہے جس کی وجہ سے ان کا ہر وار بے اثر ہو رہا ہے؟ اس شجرۂ طیبہ کی مضبوطی کا راز کیا ہے؟

مستشرقین نے ان سرچشموں کا سراغ لگانا شروع کر دیا۔جس سے اس شجرۂ طیبہ کو مسلسل غذا مہیا ہو رہی ہے۔اس تلاش نے ان کو اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ اسلام کے شجرۂ طیبہ کو تین سرچشموں سے مسلسل غذا مل رہی ہے، وہ تین سرچشمے یہ ہیں:

۱۔قرآن حکیم، ۲۔احادیث نبویہ اور ۳۔سیرت سرور عالم ﷺ

انہیں اس حقیقت کو سمجھنے میں مشکل پیش نہ آئی کہ جب تک قوت اور طاقت کے یہ سرچشمے موجود ہیں اس وقت تک نہ اسلام کے تناور درخت کو زمین بوس کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی ٹھنڈی چھاؤں اور لذیز میووں سے بنی نوع انسان کو محروم کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اس حقیقت کو پالیا کہ اسلام کا قصر رفیع قرآن حکیم، احادیث نبویہ اور سیرت مصطفویہ کے مضبوط ستونوں پر استادہ ہے، جب تک یہ ستون قائم ہیں یہ قصر رفیع قائم رہے گا، انہوں نے ان ستونوں پر تیشہ زنی شروع کر دی۔ انہوں نے قصر اسلام کے ان ستونوں کو گرانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، لیکن انہیں ہمیشہ اپنی ناکامیوں پر کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔(۶)

مستشرقین کے کام کے متعلق اس بنیادی نکتے کو سمجھ لینے کے بعد ہم ان کی اسلام دشمن کارروائیوں کو پانچ حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

1 قرآن حکیم کی مخالفت 2 احادیث نبویہ کی مخالفت

3 سیرت سرور عالم ﷺ کی مخالفت 4 شریعت اسلامیہ کی مخالفت 5 تاریخ اسلام کی مخالفت

مستشرقین نے مذکورہ بالا تمام میدانوں میں کتابوں کے ڈھیر لگا دیئے ہیں۔ انہوں نے تقسیم کار کے اصول پر عمل کیا۔ کسی نے قرآن حکیم کو اپنی مشق ستم کا نشانہ بنایا، کسی نے احادیث طیبہ پر طبع آزمائی کی۔ کسی نے مسلمانوں کو عشق مصطفیٰ ﷺ کی انمول دولت سے محروم کرنے کے لیے سیرت سرور عالم ﷺ کے عفت مآب دامن کو آلودہ کرنے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، کسی نے شریعت اسلامیہ کو صحرائی اور بدوی مزاج کے موافق قرار دے کر دور حاضر کے لیے نا قابل عمل قرار دینے کی سعی نامسعود کو اپنی زندگی کا وظیفہ بنایا اور کسی نے اسلام کی درخشندہ اور تابندہ تاریخ میں کیڑے ڈالنے کے لیے دنوں کا چین اور راتوں کی نیند قربان کر دی۔

صلیبی جنگوں کے دور میں مستشرقین نے اسلام پر جو کیچڑ اچھالا وہ ان کے متعصب، حسد، عناد اور خبث باطن کے اظہار کے سوا کچھ نہ تھا، اس دور میں انہوں نے اسلام کو ہر خوبی سے معرا اور ہر خامی کا منبع ثابت کرنے کے لیے بھرپور کوشش کی۔

انہوں نے اسلام کو بت پرستی کا مذہب قرار دیا، حضور اکرم ﷺ کے پاکیزہ دامن کو ہر گندگی سے آلودہ کرنے کی کوشش کی اور مسلمانوں کو انسانوں کے بجائے درندہ بنا کر پیش کیا، مستشرقین کے ان پروپیگنڈوں میں نہ انسانیت تھی اور نہ شرافت اس میں نہ تو صداقت کا کوئی پہلو تھا اور نہ ہی اس کی بنیاد کسی علمی تحقیق پر تھی، مستشرقین کے اس دور کے اعتراضات اپنی لغویت کی وجہ سے اس قابل نہیں کہ ان پر بحث چھیڑ کر سلیم الفطرت انسانوں کے ذوق کو مجروح کیا جائے، ان اعتراضات کو قابل اعتنا سمجھنے کی ضرورت اس لیے بھی نہیں کہ متاخر مستشرقین نے خود اپنے پیشروؤں کی ان علمی بددیانتیوں اور اخلاقی دیوالیہ پن کا پردہ چاک کر دیا ہے، اس لیے ہمیں ان الزامات اور ان کے جوابات کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔(۷)

یہ بات ذہن میں رہے کہ متاخر مستشرقین کا میدان تحقیق بھی اپنے پیشروؤں کی طرح قرآن حکیم، احادیث طیبہ،

سیرت طیبہ، شریعت اسلامیہ اور تاریخ اسلامیہ ہی ہیں۔لیکن ان کا انداز اور طریقہ واردات مختلف ہے۔

مستشرقین اور قرآن کریم

قرآن کریم ہی وہ الہامی کتاب ہے جو آج تک بعینہٖ نص ربانی کے مطابق اپنی اصلی شکل میں محفوظ و موجود ہے، لیکن مستشرقین نے اسلام کو سمجھنے کے لیے روحانیت سے صرف نظر کر کے خالص مادی نکتہ نظر سے بحث کی ہے، وہ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ وحی، نبوت اور قرآن کریم کا سرچشمہ ذات باری تعالیٰ ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دوسرے مذہبوں کے بارے میں بھی انکا دائرہ نظر محدود ہے۔ یہاں تک کہ وہ انجیل کو کلام الٰہی نہیں مانتے، بلکہ اس کو کلام الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کہتے ہیں۔

قرآن کریم کے بارے میں مستشرقین کا رویہ خصومت و افکار کا ہے۔ جو ان مستشرقین کی فطرت کا عین غماز ہے، کیونکہ قرآن کریم موجودہ توریت اور انجیل کے متعلق صاف کہتا ہے کہ یہ دونوں تحریف شدہ کتابیں ہیں اور یہ وہ نہیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اتارا تھا۔قرآن کریم نے موجودہ توریت و انجیل کی پیش کردہ خرافات کی صحیح نقاب کشائی کی، عقیدۂ توحید سے متعلق قرآن کریم نے صراحت سے کہا کہ توحید ہی دین حق کی روح ہے۔عقیدۂ تعدد الٰہ اور عقیدۂ تثلث، اس روح کے منافی، عقائد ہیں۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن کریم نے کہا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے، خدا نہ تھے، عیسائیوں کے عقیدۂ کے برخلاف ان کو نہ قتل کیا گیا، نہ ہوئی دی گئی بلکہ انہیں آسمان پر اٹھالیا گیا، قرآن کریم نے اس مضحکہ خیز عقیدہ کی بھی تردید کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مصلوب ہو کر ساری قوم کے نجات کا سامان فراہم کر دیا، قرآن کریم نے اس تصور کو بھی باطل قرار دیا کہ کوئی خاص قوم اللہ تعالیٰ کی محبوب قوم ہے۔

قرآن کریم کی اس صدق بیانی کو مستشرقین کیسے گوارا کر سکتے ہیں، چنانچہ مستشرقین کی کتابوں میں اس خیال پر عام اتفاق ہے کہ قرآن کریم کا سرچشمہ وحی الٰہی نہیں، بلکہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنا کارنامہ ہے۔

اس حقیقت کو معلوم کرنے کے لیے کسی تحقیق کی ضرورت نہیں کی مغربی تہذیب کا اگر کوئی دوسری تہذیب مقابلہ کرنے والی ہے، تو وہ اسلامی تہذیب ہے جو قرآن و سنت پر مبنی ہے، اس لیے کہ باقی تہذیبیں یا تو مغربی تہذیب میں ضم ہو گئی ہیں یا رفتہ رفتہ اسی کے اثرات میں ڈوبتی جا رہی ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد:

اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ

تمام کفار ملت واحدہ ہیں۔

کی عملی صورت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ اس تہذیب کے بھیانک نتائج سے اگر کوئی نظام انسانوں کو محفوظ رکھنے والا ہے تو وہ قرآن کریم کا دیا ہوا نظام ہے۔مغربی تہذیب کے اثراتِ بد کے ازالے کے لیے اگر کوئی تریاق فراہم کرنے والا ہے تو وہ یہی ہدایت نامہ ہے۔اس تہذیب کے رہنماؤں وہم نواؤں کی زیادتی و ناانصافی، قتل و غارت گری اور ایذا رسانی کے شکار اہل اسلام کو ہمت و حوصلہ مندی، صبر و استقلال اور سخت سے سخت آزمائش میں دین

وشریعت پر جمے رہنے کی طاقت نصیب ہوتی ہے تو اسی کتاب مبین کی دی ہوئی ہدایات وتعلیمات سے۔ان سب سے اہم یہ کہ اسلام اور اہل اسلام کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کے تمام ذرائع استعمال کرنے کے باوجود جو چیز خود اہل مغرب کو اسلام کے قریب لا رہی ہے اور انہیں ایمان کی سعادت نصیب کرا رہی ہے، وہ یہی کتابِ ہدایت ورحمت ہے۔(۸)

اس لیے بلاتکلف یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج مغربی تہذیب کے لیے سب سے بڑا چیلنج قرآن کریم ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ساری سازشوں اور مال و دولت اور قوت و طاقت کے بے جا استعمال کے باوجود اہل مغرب اس چیلنج کا جواب نہیں دے پا رہے ہیں۔اس لیے کہ قرآن کریم کی تعلیمات حق وصداقت پر مبنی ہیں۔

مختصر یہ کہ قرآن مجید کے مغربی تہذیب کے لیے ایک عظیم چیلنج ہونے کو اہل مغرب نہ صرف یہ کہ محسوس کرتے ہیں بلکہ اس پر اپنا غم وغصہ، حیرانی وردعمل اپنی تقریروں تحریروں اور کارستانیوں کے ذریعے ظاہر کرتے رہتے ہیں، اس کا نشانہ خاص طور سے اسلام پسندوں یا ان مسلمانوں کو بناتے ہیں، جو قرآنی فکر کو عملی طور پر برتنے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسروں میں اس کی اشاعت کرتے ہیں یا وہ ان کتابوں اور اداروں کے خلاف محاذ قائم کرتے ہیں جو قرآنی فکر کی پختگی وترویج کا ذریعہ بنتے ہیں اور افراد سازی کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے نمائندے (مستشرقین) یہ بات اچھی طرح سمجھ گئے ہیں کہ مسلمانوں کی فکر کا اصل سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔جسے ترویج آپ ﷺ کے اسوۂ مبارک سے ملتی ہے۔اس لیے اگر ان سے مسلمانوں کا تعلق کمزور کردیا جائے تو ان کی تہذیب کی راہ میں اور کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

مستشرقین کے تحت الشعور میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ اس کے لیے سب سے بڑا چیلنج مسلمانوں کا قرآن وسنت پر کاربند رہنا ہے اور غیر مسلموں کا قرآنی تعلیمات اور اسوۂ نبوی ﷺ سے متاثر ہونا ہے۔اس وجہ وہ خاص طور سے دو محاذوں پر اپنی مہم میں سرگرم ہیں۔

اول:۔ یہ کہ مختلف طریقوں بالخصوص جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعہ مسلمانوں میں مغربی تہذیب کو پھیلانا اور ایسے انداز میں اسے پیش کرنا کہ وہ اس کو قبول کرلیں اور قرآن وسنت سے ایسے غافل ہوجائیں کہ اس تہذیب کی مخالفت یا مدافعت کی حس بھی ختم ہوجائے۔

دوم: اسلام، اسلامی شریعت، قرآن کریم اور نبی کریم ﷺ کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کرنا اور دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کرنا کہ ان کی پیروی میں ہر طرح کی خرابی اور خامی ہے۔مختصراً یہ کہ اس میں انسانیت کی تباہی ہے۔

قرآن حکیم مستشرقین کے حملوں کی جہتیں:

قرآن حکیم مستشرقین کو اپنے وجود کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ نظر آتا ہے۔اس لیے مستشرقین نے اس کا مقابلہ کرنے کا تہیہ کرلیا۔قرآن حکیم کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے انہوں نے مختلف زاویوں سے اس کتاب مبین پر وار کیے۔ انہوں نے بیک زبان ہوکر اعلان کیا کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں، بلکہ یہ حضرت محمد ﷺ کی اپنی تصنیف ہے۔

انہوں نے قرآن حکیم کی تدوین اور حفاظت پر اعتراض کر کے اس کے ایک مستند دستاویز ہونے کا بھی انکار کیا۔ انہوں نے قرآن حکیم کی فصاحت و بلاغت اور اس کی شان اعجاز پر بھی طبع آزمائی کی۔ انہوں نے اس کے مضامین، اس کی ترتیب اور اس کے اسلوب کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ قرآن حکیم کی تعلیمات بھی مستشرقین کے طعن و تشنیع کے تیروں سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ مستشرقین نے قرآن حکیم کی جمع و تدوین پر بھی دل کھول کر اعتراضات کیے، تاکہ اس بات پر سے مسلمانوں کا ایمان متزلزل ہو جائے کہ آج ہمارے ہاتھوں میں جو قرآن حکیم ہے وہ بعینہ وہی ہے جو حضور ﷺ پر نازل ہوا تھا وہ قرآن حکیم کی مختلف قراءتوں کو قرآن حکیم کے مختلف Version قرار دیتے ہیں۔

قرآن حکیم کے کلام اللہ ہونے پر اعتراض:

مذکورہ بالا قرآن حکیم پر مستشرقین کے حملوں کی تمام جہتیں بیان کرنا اور ان کی قلعی کھولنا اس مختصر مقالہ میں ممکن نہیں، البتہ ایک جہت ان کی کارستانیوں کے حوالے سے بیان کی جائیں گی۔

مسلمانوں کا ایمان ہے کہ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے امین فرشتے حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعہ حضرت محمد ﷺ کے قلب اطہر پر نازل فرمایا، اس مقدس کلام کے الفاظ و معانی سب الہامی ہیں۔ درج ذیل آیات قرآنیہ ملاحظہ فرمائیے۔

> قسم ہے ستارے کی جب وہ گرے۔ (اے مکہ کے باشندوں!) یہ تمہارے ساتھ رہنے والے صاحب نہ راستہ بھولے ہیں، نہ بھٹکے ہیں، اور یہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے۔ یہ تو خالص وحی ہے جو ان کے پاس بھیجی جاتی ہے۔ انہیں ایک ایسے مضبوط طاقت والے (فرشتے) نے تعلیم دی ہے۔ جو قوت کا حامل ہے، چنانچہ وہ سامنے آ گیا۔ جبکہ وہ بلند افق پر تھا۔ پھر وہ قریب آیا، اور جھک پڑا۔ یہاں تک کہ وہ دو کمانوں کے فاصلے کے برابر آ گیا، بلکہ اس سے بھی زیادہ نزدیک، اس طرح اللہ کو اپنے بندے پر جو وحی نازل فرمانی تھی، وہ نازل فرمائی۔ جو کچھ انہوں نے دیکھا، دل نے اس میں کوئی غلطی نہیں کی۔ کیا پھر بھی تم ان سے اس چیز کے بارے میں جھگڑتے ہو جسے وہ دیکھتے ہیں؟ اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اس (فرشتے) کو ایک اور مرتبہ دیکھا ہے۔ اس بیر کے درخت کے پاس جس کا نام سدرۃ المنتہیٰ ہے۔ اسی کے پاس جنت الماوی ہے۔ اس وقت اس بیر کے درخت پر وہ چیزیں چھائی ہوئی تھیں جو بھی اس پر چھائی ہوئی تھیں۔ (پیغمبر کی) آنکھ نہ تو چکرائی اور نہ حد سے آگے بڑھی۔ (۱۰)
>
> (آسان ترجمۂ قرآن، از مفتی محمد تقی عثمانی صاحب)

مذکورہ بالا آیات قرآنیہ ببانگ دہل مستشرقین کے اس اعتراض کی تکذیب کر رہی ہیں، جو گمراہی پھیلانے کے لیے وہ کرتے ہیں کہ قرآن حکیم کلام اللہ نہیں بلکہ یہ محمد ﷺ کی اپنی تصنیف ہے۔

ان آیات قرآنیہ کی تفسیر ومطالب اور نکات کی تفصیل میں جائے بغیر مضمونِ آیات کو اجمالاً دیکھا جائے تو یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ واسلام پر بذریعہ وحی حضرت جبریل امین علیہ السلام کے واسطے نازل کیا گیا جو غیر معمولی قوت وطاقت کے حامل ہیں، کوئی شیطان یا کوئی غیر اس میں دجل وفریب اور مداخلت سے کام نہیں لے سکتا اور آپ ﷺ پر جبریل امینؑ مشتبہ نہیں ہو سکتے آپ انہیں خوب اچھی طرح پہچانتے ہیں، آپ نے انہیں دو مرتبہ انتہائی قریب سے دیکھا ہے۔

ایک اور جگہ اللہ رب العزت نے قرآن حکیم کے کلام اللہ ہونے کو بڑے عجیب انداز سے بیان فرمایا ہے:

> اب میں قسم کھاتا ہوں اس کی بھی جسے تم دیکھتے ہو۔ اور اس کی بھی جسے تم نہیں دیکھتے ۔ کہ یہ (قرآن) ایک معزز پیغام لانے والے کا کلام ہے۔ اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔ (مگر) تم ایمان تھوڑا ہی لاتے ہو۔ اور نہ یہ کسی کاہن کا کلام ہے۔ (مگر) تم سبق تھوڑا ہی لیتے ہو۔ یہ کلام تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے اتارا جا رہا ہے۔ اور اگر (بالفرض) یہ پیغمبر کچھ (جھوٹی) باتیں بنا کر ہماری طرف منسوب کر دیتے۔ تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑتے۔ پھر ہم ان کی شہ رگ کاٹ دیتے۔ پھر تم میں سے کوئی نہ ہوتا جو ان کے بچاؤ کے لیے آڑے آ سکتا۔ (۱۲)

مذکورہ بالا آیات قرآنیہ بھی قرآن حکیم کے کلام اللہ ہونے کو علی الاعلان بیان کر رہی ہیں، نیز یہ کہ آپ ﷺ کی تصنیف اور خود ساختہ کتاب ہونے کے شبہ کو سختی کے ساتھ رد کر رہی ہیں۔

مستشرقین کا یہ کہنا کہ قرآن کریم اللہ رب العزت کا کلام نہیں بلکہ آنحضرت ﷺ کی تصنیف ہے، آیت ذیل اس کی مخالفت کر رہی ہے:

> اور تم اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھے تھے، اور نہ کوئی کتاب اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو باطل والے مین میخ نکال سکتے تھے۔ (۱۴)

درحقیقت مستشرقین کی اکثریت یہودیت ونصرانیت سے تعلق رکھتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے بھی قائل ہیں۔ فلاں انسانیت کے لیے آسمانی ہدایت کی اہمیت پر بھی یقین رکھتے ہیں اور اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہر شک وشبہ سے بالاتر ہوتا ہے۔

اگر وہ قرآن حکیم کو اللہ تعالیٰ کا کلام مان لیں تو دین اسلام کی مخالفت کا ان کا سارا منصوبہ خاک میں مل جاتا ہے۔ قرآن حکیم کو کلام اللہ مان لینے کے بعد ان کے لیے حضور اقدس ﷺ کی رسالت کے انکار کی بھی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس صورت میں انہیں قرآن حکیم میں بیان کردہ حقائق پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ بلکہ قرآن حکیم نے ان کی جن کوتاہیوں کا پردہ چاک کیا ہے، انہیں ان کا الزام بھی اپنے سر لینا پڑتا ہے، نیز قرآن حکیم کو کلام اللہ مان لینے کی صورت

میں اہل یورپ کی نسلی برتری کا تاج محل دھڑام سے زمین بوس ہوجاتا ہے۔

اس صورت حال میں مستشرقین کے پاس دو ہی راستے رہ جاتے ہیں، یا تو کلمہء توحید پڑھیں، قرآن کریم کو اپنی زندگی کا منشور بنائیں اور یا پھر قرآن حکیم کے کلام اللہ ہونے کا صاف انکار کردیں، بدقسمتی سے مستشرقین نے یہی دوسرا راستہ اپنایا ہے، بلکہ یہی وہ واحد نکتہ ہے، جس پر ساری دنیائے استشراقیت متحد ہے۔

جس طرح نصف النہار پر پوری آب و تاب سے چمکتے ہوئے آفتاب کا انکار کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اسی طرح قرآن حکیم (جس کی روشنی سے صدیوں ایک عالم جگمگا تا رہا) کا انکار بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔

اب ذرا چند مشہور مستشرقین کی تحریروں کو ملاحظہ کیجیے اور اندازہ کیجیے کہ وہ کس طرح کلام الٰہی کو اپنے عیارانہ اسلوب میں آپ ﷺ کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔

جارج سیل (George Sale) ایک مشہور مستشرق ہے، اس کا ترجمہ قرآن کریم مستشرقین کے لیے ایک اہم علمی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے وہ ترجمہ قرآن کریم کے مقدمے میں لکھتا ہے۔

> کلام میں لفاظی حاضرین کے ذہنوں پر زبردست اثر ڈالتی ہے۔ محمد ﷺ اس سے بے خبر نہ تھے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے ان نام نہاد الہامات میں اسلوب بیان کے اس اتار اور رفعت کو قائم رکھنے کے لیے اپنی پوری صلاحیتیں استعمال کی ہیں، جو اس ذات کے شایانِ شان ہو، جس کی طرف وہ ان کو منسوب کرتے ہیں۔ اور اس اسلوب کو اختیار کیا ہے۔ جو عہد نامہ قدیم کے پیغمبرانہ اسلوب سے ہم آہنگ ہو سکے۔ بلکہ انہوں نے فن بلاغت کے دیگر اصولوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اور اس میں وہ اس حد تک کامیاب ہوئے اور انہوں نے اپنے مخالفین کے اذہان کو یوں گرویدہ کیا کہ ان کے کئی مخالفین نے اسے جادو اور سحر قرار دیا۔ (۱۵)

یہی جارج سیل (Gearge Sale) قرآن حکیم سے متعلق اپنا آخری فیصلہ صادر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> اس حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں کہ قرآن کے مصنف یا اس کتاب کو اختراع کرنے والے محمد (ﷺ) ہیں، اگرچہ اس بات کا غالب امکان موجود ہے کہ اس منصوبے میں ان کو دوسرے لوگوں سے جو مدد ملی وہ کم نہ تھی۔ جیسا کہ ان کے اہل وطن نے ان پر یہ اعتراض کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ البتہ ان کو اس قسم کی مدد مہیا کرنے والے مخصوص شخص کے تعین میں ان کے مفروضے باہم اتنے متضاد تھے کہ یوں محسوس ہوتا ہے، وہ محمد (ﷺ) کے خلاف اس الزام کو ثابت نہ کر سکے۔ یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ محمد (ﷺ) نے اس معاملے کو خفیہ رکھنے کے لیے اتنے عمدہ اقدامات کئے تھے کہ ان کی وجہ سے اس راز کا انکشاف ممکن نہ تھا۔ (۱۶)

آرتھر جیفری (Arthar Jeffery) اپنی کتاب (Muhammad Islam, his Religious) میں اپنے قارئین کو قرآن حکیم کا تعارف ان الفاظ میں کراتا ہے۔

> قرآن اسلامی صحیفہ ہے۔اسے قرآن عظیم اور قرآن مجید وغیرہ ناموں سے پکارا جاتا ہے، لیکن اسے Holy Quran یعنی قرآن پاک نہیں کہا جاتا، کچھ جدید دور کے مغرب کے تعلیم یافتہ مسلمان Holy Bible کے لقب کی نقل کر کے قرآن کو بھی Holy Quran یعنی قرآن پاک کہتے ہیں۔ یہ کتاب محمد (ﷺ) کے بیس سالہ دور نبوت کے بیانات کے مجموعے پر مشتمل ہے، یہ بات ظاہر ہے کہ محمد (ﷺ) ایک ایسی کتاب کی تیاری میں مصروف تھے جو مسلمانوں کے لیے وہی حیثیت رکھے جو یہودیوں کے لیے عہد نامہ قدیم اور عیسائیوں کے لیے عہد نامہ جدید کی ہے۔لیکن اس کتاب کی تکمیل سے پہلے وہ فوت ہو گئے اور آج قرآن میں جو کچھ موجود ہے یہ وہ ہے جو ان کے بعد ان کے پیروکاروں نے جمع کیا اور اسے محمد (ﷺ) کے الہامات کے مجموعے کے طور پر شائع کر دیا۔(۱۷)

ڈبلیو منٹگمری واٹ (W. Montgamery Watt) کا انداز بالکل ہی نرالا ہے۔ان کے انداز فکر کی کچھ جھلک ملاحظہ کیجیے:

> مسلمانوں کی روایت کے مطابق قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور محمد (ﷺ) نے خود بھی یہی سمجھا ہوگا۔مزید برآں یہ بھی ممکن ہے کہ محمد (ﷺ) یہ اعتقاد رکھتے ہوں کہ وہ اپنے ذاتی خیالات اور اس وحی میں تمیز کر سکتے ہیں، جو خارج سے ان پر نازل ہوتی ہے۔محمد (ﷺ) کو مخلص کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے عقائد میں ٹھیک راستے پر تھے، ممکن ہے ایک آدمی مخلص کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے عقائد میں ٹھیک راستے پر تھے ممکن ہے ایک آدمی مخلص ہو لیکن اس کے باوجود غلطی پر ہو۔انسان جن خیالات کو خارج سے آتا ہوا محسوس کرتا ہے ممکن ہے وہ خیالات دراصل اس کے اپنے لاشعور سے ابھرے ہوں۔(۱۸)

جرمن مستشرق ہوبرٹ گریم (Hubert Grimme) اپنی کتاب ''محمد'' (ﷺ) میں لکھتا ہے:

> شروع میں محمد (ﷺ) کسی نئے مذہب کے داعی نہ تھے، وہ جس چیز کی دعوت دے رہے تھے اسے ہم ایک طرح کی ''اشتراکیت'' کہہ سکتے ہیں، اسلام کو اس کی اصل ابتدائی صورت میں دیکھنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم اسے اس سے پہلے موجود مذہب کی نقل ٹھہرائیں، جس سے محمد (ﷺ) کی تعلیمات کی توجیہہ ہو سکے، کیونکہ جب ہم اسلام کا براہ راست مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ مذہبی عقائد کے بجائے ایک سماجی اصلاح کے لیے جدوجہد کی صورت میں سامنے آیا

جس کے پیش نظر بگڑے ہوئے حالات کی اصلاح کرنا اور بالخصوص حریص دولت مندوں اور پریشان حال غریبوں کے درمیان واضح فرق کو مٹانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ضرورت مندوں کی مدد کے لیے ایک متعین ٹیکس عائد کیا، وہ اگر آخرت میں حساب وکتاب کی باتیں کرتے ہیں تو اس کا مقصد اپنی دعوت کو تقویت پہنچانا اور لوگوں پر نفسیاتی دباؤ ڈالنا ہوتا ہے۔(۱۹)

''تاریخ ادیان عالم''(Maniel del Hitore des Religions) میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ:

دعوت کے ابتدائی دور میں نبی کا پیرایہ بیان جذباتی تھا، مختصر جملوں اور شاندار اسلوب میں نمایاں طور پر رنگ آمیزی کر کے جزا وسزاء کی کیفیات بیان کرتے تھے، بسا اوقات آیتوں کی تکرار سے اکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے، کہیں کہیں یہ تکرار الٹا مفہوم پیدا کر دیتی ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد نبی کا یہ ابتدائی اسلوب بدل گیا اب وہ خوبصورت انداز میں انبیاء کے واقعات پیش کرنے لگے، یوسف اور ان کی بیوی (بوتیفار) کی داستانِ محبت کو انہوں نے اسی انداز میں پیش کیا۔ یہ انداز ایران اور ترکی کے بہت سے شاعروں کے لیے خیالی انگیز ثابت ہوا۔ آخری دور میں نبی کے اسلوب نے گرمی بیان اور فن کاری کو کم کر دیا، اب وہ یہودیوں اور عیسائیوں سے مناظرہ کرنے پر فریفتہ نظر آتے ہیں۔(۲۰)

فرانسیسی مستشرق کلیمنٹ ہوارٹ (Clement Haurt) نے اپنے ایک مضمون میں ایک نادر خیال پیش کیا ہے، اس نے قرآن کے ایک نئے سرچشمہ کی دریافت کا دعویٰ کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ قرآن مجید امیہ بن ابی الصلت کے اشعار سے ماخوذ ہے۔ اس نے امیہ بن ابی الصلت کے اشعار اور قرآن کی بعض آیتوں کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ان اشعار کی نسبت امیہ کی طرف صحیح ہے، کیونکہ ان میں ثمود وصالح وغیرہ کے واقعات کی طرف اشارہ ملتا ہے، قرآن کریم میں ان ہی واقعات کی تفصیلات موجود ہیں، اگر وہ اشعار منقول ہوتے تو ان میں اور قرآن کے بیان کردہ واقعات میں کامل طور پر یکسانیت ملتی۔ قرآن حکیم کو انسانی اختراع قرار دینے کے لیے دور کی کوڑی لاتے ہوئے پھر وہ لکھتا ہے کہ:

چونکہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قرآن کو ترتیب دینے میں امیہ بن ابی الصلت کے اشعار سے مدد لی تھی، اسی وجہ سے مسلمانوں نے امیہ کی شعری تخلیقات کو باقی نہیں رکھا تاکہ وہ قرآن کے نئے پن پر اثر انداز نہ ہو سکیں، اور ان کے اس دعوے پر کوئی حرف نہ آئے کہ آسمان وحی کے ذریعے ہی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قرآن ملا ہے۔(۲۱)

واضح رہے کہ امیہ بن ابی الصلت نے جاہلیت اور اسلام دونوں کا زمانہ پایا، اس کو اندازہ تھا کہ ایک نبی آنے والا ہے۔ مگر اس کا خیال تھا کہ وہ نبی وہ خود ہوگا، وہ بت پرستی سے بیزار تھا، مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت ملی تو حسد کی وجہ سے ایمان لانے سے انکار کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب اس کے اشعار سنے تو فرمایا اس کا دل مومن ہے، مگر وہ کافر ہے، وہ

اپنے اشعار میں نبیوں کا قصہ بھی بیان کرتا تھا، دیکھئے الشعر والشعراء ابن قتیبہ دینوری مطبوعہ مصر، ۱۳۶۴ھ، صفحہ نمبر ۴۲۹۔

مشہور برطانوی مستشرقہ کیرن آرم اسٹرانگ اپنی کتاب Muhammad Prophet for our Time میں رقم طراز ہیں:

> اپنے عہد کے زیادہ تر عربوں کی طرح آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی (حضرت) نوحؑ، لوطؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی کہانیوں سے واقف تھے اور یہ کلمات تھے، کہ کچھ لوگ ایک عرب پیغمبر کے منتظر تھے۔(۲۲)

میں کیرن آرم اسٹرانگ لکھتی ہیں:

> متعدد یہودیوں سے دوستانہ تھا اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے کافی کچھ سیکھا، لیکن اہل کتاب کے کچھ نظریات کو آپ نے واقعی بہت عجیب وغریب پایا۔ ایک تخصیص پسند مذہب کا تصور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے اجنبی تھا۔(۲۳)

مذکورہ بالا چند تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کے کلام الٰہی ہونے کا افکار جن بنیادوں پر مکہ کے بت پرستوں نے کیا تھا مستشرقین کا رویہ اس سے کچھ مختلف نہیں، جس طرح مستشرقین قرآن حکیم کو انسانی کلام ثابت کرنے کے لیے بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں، کفار مکہ بھی اسی طرح کی باتیں کرتے تھے، جس طرح مستشرقین کو بات کہتے ہوئے مطلق یہ احساس نہیں ہوتا کہ ان کی بات کتنی کھوکھلی ہے اور بے وزن ہے مشرکین مکہ کی کیفیت بھی بالکل اسی قسم کی تھی۔

نیز مستشرقین کی ان تحریروں سے جو تاثر انسان کے ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ کیا اس بات پر تو متفق ہیں کہ قرآن حکیم اللہ کا کلام نہیں ہے، لیکن پھر یہ ہے کیا اور اس کا مصدر کیا ہے؟ اس سوال کے جوابات کے لیے انہوں نے ظن وتخمین کے جو گھوڑے دوڑائے ہیں ان کو دیکھ کر وہ ذہنیت سامنے آجاتی ہے، جس کی نشاندہی قرآن حکیم نے کئی مقامات پر کی ہے۔

.....ویظنون

وہ محض ظن سے کام لے رہے ہیں۔

ان ھم الا یخرصون

وہ محض اٹکلیں دوڑا رہے ہیں۔

مستشرقین نے قرآن حکیم کو اللہ کا کلام نہ ماننے کے لیے جو روایات بیان کی ہیں، ان کا مقصد کیا، اس کا کچھ پتا تحقیق کے بجائے تنقیص کا یہ جدید طریقہ جس کے موجد خود مستشرقین ہیں، جب کسی اسلامی عقیدے یا نظریئے کو باطل کرنے میں ناکام ہوجاتے ہیں تو خاموش ہوکر نہیں بیٹھتے، بلکہ وسوسوں کے بازار میں بیٹھ کر تخیل کی وہ سوداگری کرتے ہیں جس سے اس عقیدے پر مسلمانوں کا ایمان متزلزل ہوجائے۔

اس حقیقت کا اظہار ایک نومسلم یہودی محمد اسد سے بہتر کسی نے نہیں کیا ہے۔ جو خود بھی ایک مشہور مصنف ہیں وہ لکھتے ہیں:

اسلام کے متعلق مغربی مصنفین کا رویہ محض ناپسندیدگی پر مشتمل نہیں ہے، جیسا کہ دوسرے ''غیر ملکی'' مذاہب'' اور تمدنوں کے سلسلے میں رہا ہے۔ بلکہ یہ ایک شدید مجنونانہ نفرت پر مبنی ہے، جس کی جڑیں بہت گہری ہیں، یہ نفرت صرف عقل و دانش تک محدود نہیں ہے بلکہ جذباتی طور پر بھی دلوں میں گھر کر چکی ہے۔ مغربی ذہن بدھ مت اور ہندومت کے فلسفے کو قبول نہیں کرے گا، لیکن ان مذاہب کے متعلق اس کا رجحان متوازن اور سنجیدہ غور فکر پر مشتمل ہوگا۔ اس کے برخلاف جب اسلام کا سوال آتا ہے تو یہ توازن بگڑ جاتا ہے اور ایک جذباتی تعصب در آتا ہے۔ چند ایک کو چھوڑ کر یورپ کے بہت سے مشہور و معروف مستشرقین بھی اسلام کے متعلق اپنی تحریروں میں غیر سائنسی تعصب کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ان کی تحقیقی کتابوں سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا اسلام کو ایک موضوع کا نہیں بلکہ کٹہرے میں کھڑے ہوئے ملزم کا درجہ ہی دیا جاسکتا ہے۔ جو اپنے محتسبوں کے سامنے صفائی پیش کر رہا ہو، بعض مستشرقین سرکاری وکیل کا کردار ادا کرتے ہیں، جن کا مقصد ہی اسلام کو مجرم قرار دینا ہوتا ہے، جبکہ دوسرے مستشرقین ایسے وکیل صفائی کا کردار ادا کرتے ہیں جن کو یہ خود یقین ہوتا ہے کہ ان کا مؤکل قصوروار ہے، پھر بھی وہ بے دلی سے سزا میں تخفیف کی وکالت کرتے ہیں۔ (۲۴)

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے یورپ کے طویل سفر میں مستشرقین کی معیت میں متعدد یونیورسٹیوں کا مشاہدہ کیا تھا، جس کے بعد انہوں نے مستشرقین کے مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد کی نشاندہی کی ہے۔

1 نصوص کو اپنے خودساختہ نظریہ فکر اور من مانی خواہشات کے مطابق اور تابع کر دینا۔

2 بالقصد و رواوہ نصوص میں تحریف کر دینا۔

3 تحریف کی گنجائش نہ ہونے کی صورت میں عبارت کا غلط مطلب نکالنا۔

4 مآخذ و مصادر کے بارہ میں اپنا فیصلہ تھوپنا۔

چنانچہ وہ ادبی کتابوں سے حوالے نقل کر کے اسے حدیث کے مباحث میں چسپاں کر دیتے ہیں، اور کتب تاریخ کے حوالے دے کر انہی کے مطابق فقہی مسائل میں اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں وہ دمیریؒ کی کتاب الحیوان کی روایتوں کو تو صحیح قرار دیتے ہیں، مگر امام مالک رحمہ اللہ کی مؤطا کی روایتوں کی تکذیب کرتے ہیں۔ یہ ان کی تحقیق کا معیار ہے۔ (۲۵)

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اپنی مایہ ناز کتاب علوم القرآن میں مستشرقین کے معاندانہ اسلوب کی حقیقت آشکار فرماتے ہوئے کچھ جوابات تحریر فرماتے ہیں، وہ بتصرف ملاحظہ ہوں۔ مفتی صاحب لکھتے ہیں:

ایک زمانہ تھا کہ جب مستشرقین عیسائیت کے شدید تعصب میں مبتلا ہو کر کھلم کھلا یہ کہا کرتے تھے

کہ قرآن کریم (معاذ اللہ) آنحضرت ﷺ کی جانی بوجھی تصنیف ہے اور (معاذ اللہ) آپ ﷺ کا دعوائے نبوت خود ساختہ تھا۔ لیکن اب خود مستشرقین کا کہنا یہ ہے کہ پچھلے مستشرقین کا یہ نظریہ محض ایک معاندانہ دعویٰ تھا، جس کی پشت پر کوئی دلیل نہیں تھی، اور آنحضرت ﷺ کی پوری زندگی اس کی تکذیب کرتی ہے۔

عہد حاضر کے معروف مستشرق پروفیسر منٹگمری واٹ لکھتے ہیں:

قرون وسطیٰ کے یورپ میں یہ تصور عام کیا گیا کہ محمد (ﷺ) ایک (معاذ اللہ) جھوٹے پیغمبر تھے، جو غلط طور پر یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے، لیکن قرون وسطیٰ کے یہ تصورات جو دراصل جنگی پروپیگنڈے کی حیثیت رکھتے تھے، اب آہستہ آہستہ یورپ اور عیسائی دنیا کے ذہنوں سے اتر رہے ہیں۔

پروفیسر واٹ نے بالکل درست کہا کہ آنحضرت ﷺ کی یہ تکذیب کسی عملی دلیل پر مبنی نہیں تھی، بلکہ یہ اس پروپیگنڈے کا ایک جز تھا جسے مسلمانوں سے لڑنے کے لیے ضروری سمجھا جا رہا تھا۔ انہوں نے خاصی تفصیل سے قدیم مستشرقین کے خیالات کی تردید کی اور بتایا کہ عہد حاضر کے مستشرقین روشن دلائل کی وجہ سے ان الزامات کو تسلیم نہیں کرتے، آخر میں وہ لکھتے ہیں:

لہٰذا محمد (ﷺ) کے بارے میں قرون وسطیٰ کے اس قصور کو تو اب خارج از بحث قرار دیدینا چاہئے اور محمد (ﷺ) کو ایک ایسا انسان سمجھنا چاہئے جو پورے خلوص اور نیک نیتی سے وہ پیغامات سناتے تھے جن کے بارے میں ان کا عقیدہ تھا کہ یہ ان کے پاس خدا کی طرف سے آئے ہیں۔

اس اعتراف کے بعد انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ صاف الفاظ میں سرکار دو عالم ﷺ کی نبوت و رسالت کا اقرار کرلیا جاتا، لیکن صدیوں سے ذہنوں میں جمے ہوئے تصورات آسانی سے نہیں مٹتے، چنانچہ منٹگمری واٹ اور ان کی طرح کے عہد حاضر کے مستشرقین ایک طرف تو یہ اعتراف کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنے دعوائے نبوت میں مخلص تھے، دوسری طرف اپنے مذہب کو علی الاعلان چھوڑ کر اسلام کو اختیار کرلینا ان کے لیے مشکل ہے، لہٰذا انہوں نے ایک بیچ کی راہ تلاش کرنے کے لیے آنحضرت ﷺ کے دعوائے نبوت کی ایک عجیب وغریب توجیہ پیش کی ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ نبی کریم ﷺ پر نازل ہونے والی وحی درحقیقت کوئی خارجی چیز نہیں، بلکہ (معاذ اللہ) یہ ایک اندرونی کیفیت تھی، جو آپ ﷺ کے طویل غور وفکر اور مشاہدات کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی، اور جسے آپ ﷺ نے پوری دیانتداری سے اللہ تعالیٰ کی یا کسی فرشتے کی آواز سمجھا۔ آپ ﷺ اپنی قوم کے مذہب اور ان کے طور طریقوں سے بیزار تھے اور اس حوالے سے تنہائی میں کافی غور وفکر کرتے تھے، اسی مقصد کے لیے آپ ﷺ نے غار حرا کی تنہائیوں میں کئی کئی دن گزارنے شروع کیے۔ غار حرا کی ان تنہائیوں میں جہاں کوئی بات کرنے والا نہیں تھا، عقیدۂ توحید کا تصور آپ

ﷺ کے دل و دماغ میں اس قدر محیط ہو گیا کہ آپ ﷺ کو اپنے دل کی یہ آواز ایک خارجی آواز محسوس ہونے لگی، اور اسے آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی یا کسی فرشتے کی آواز سمجھ کر پورے خلوص و دیانت سے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔

یہ ہے سرکار دو عالم ﷺ کے دعوائے نبوت کی وہ توجیہ جسے آج کل ''دانشوران مغرب'' میں مقبول عام حاصل ہے، مستشرقین میں سے ایک دو نہیں بلکہ بیسیوں محققین اس کے قائل ہیں کہ یہاں تک کہ بعض مسلمان کہلانے والے افراد بھی اس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ لیکن ذرا غور فرمایئے کہ اس توجیہ کے پیچھے اس کے سوا اور کیا ذہنیت کارفرما ہے کہ ان ''دانشوروں'' نے یہ بات پہلے ہی طے کر لی کہ سرکار دو عالم ﷺ کی نبوت کی تصدیق ان کے لیے ممکن نہیں، خواہ اس پر کتنے روشن دلائل قائم ہو جائیں، اور خواہ اس نبوت کی تردید کے لیے کتنی دور از کار، نا قابل فہم یقین تاویلات کو اختیار کرنا پڑے، واقعہ یہ ہے کہ پروفیسر واٹ اور عصر حاضر کے دوسرے مستشرقین آپ ﷺ پر نازل ہونے والی وہی کی جو توجیہ کرتے ہیں اس کا کوئی علمی اور عقلی جواب دیتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، تاہم مندرجہ ذیل حقائق پر غور فرمایئے:

۱.....کیا یہ بات ذہن میں آسکتی ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ جن کے بارے میں خود مستشرقین کا اعتراف یہ ہے کہ بہترین ذہنی اور عملی صلاحیتوں سے مالا مال تھے، ۲۳ سال تک مسلسل اپنی ایک اندرونی کیفیت کو کسی فرشتے کی آواز سمجھتے رہیں، اور آخر وقت تک یہ پتا نہ لگا سکیں کہ اس غیر معمولی کیفیت کی حقیقت کیا ہے۔

۲.....پھر اگر یہ نام نہاد ''اندرونی کیفیت'' اپنی قوم کو دیکھ کر طاری ہوتی تھی تو قاعدے کا تقاضا یہ تھا کہ اس کیفیت کے سب سے پہلے تجربے میں آپ کی گمراہیوں کی تردید اور عقیدۂ توحید کا بیان ہوتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ پر نازل ہونے والی پہلی وحی میں نہ کفر و شرک کی تردید ہے، نہ عقیدۂ توحید کا ذکر ہے، اس کے بجائے اس کے الفاظ یہ ہیں:

> ترجمہ: ''پڑھو اپنے پروردگار کا نام لے کر جس نے تم کو پیدا کیا، انسان کو دم بستہ سے پیدا کیا، پڑھو، اور تمہارا پروردگار کریم ترین ہے، جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا، انسان کو ان باتوں کی تعلیم دی جو وہ نہیں جانتا تھا۔''

۳..... پھر یہ عجیب بات ہے کہ یہ ''کیفیت'' ایک مرتبہ پیش آنے کے بعد فوراً ٹھنڈی پڑ جاتی ہے، اور تین سال آپ کو کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اس عرصے میں آپ وحی کے انقطاع سے پریشان بھی رہتے ہیں، لیکن تین سال تک مکمل سکوت طاری رہتا ہے، اس کے بعد پھر وحی نازل ہوتی ہے، تو اس میں بھی شرک کی واضح تردید نہیں کی جاتی اور نہ اہل عرب کی عملی گمراہیوں کا کوئی ذکر ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ کیفیت آپ ﷺ پر اپنی قوم کی گمراہیوں پر سوچ بچار اور تصور توحید کے غلبہ سے پیدا ہوئی تھی تو وحی کے بالکل ابتدائی واقعات میں یہ تصور کہاں گئے تھے؟ اور تین سال تک ان تصورات کے غلبے نے کوئی آواز کیوں نہیں سنائی؟

۴.....اگر یہ کوئی ''اندرونی کیفیت'' تھی تو پوری طرح آپ ﷺ کے خیالات سے ہم آہنگ ہونا چاہیے تھا،

لیکن قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر آپ ﷺ کے ذاتی خیالات کے خلاف ہدایات دی گئی ہیں، بلکہ بعض مقامات پر آپ کی ذاتی رائے کی تردید اور اس پر ایک لطیف عتاب بھی موجود ہے۔

۵.....اگر بالفرض مان لیا جائے کہ کسی تصور کا شدید غلبہ انسان کو ایک ''خارجی آواز'' کی طرح محسوس ہونے لگتا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ یہ ''خارجی آواز'' جو پیش گوئی کردے وہ ہمیشہ سچ نکلے، جو حکم دے دے وہ انجام کار درست ثابت ہو، جو الفاظ بول دے وہ ایسے پتھر کی لکیر بن جائیں کہ دنیا بھر کے ادیب وخطیب اس کے مقابلہ سے عاجز ہوکر بیٹھ جائیں، یہاں تک کہ اسی کلام کی بنیاد پر پورے جزیرۂ عرب میں ایسا انقلاب عظیم برپا ہوجائے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ہے۔(۲۶)

مراجع وحواشی

(۱) نثار احمد، ڈاکٹر، مستشرقین اور مطالعہ سیرت، نقوش، رسول نمبر، ج۱۱، ص ۴۹۳ (۲) حوالہ بالا، ص ۴۹۴

(۳) شیرف الدین اصلاحی، ڈاکٹر، مستشرقین، استشریق اور اسلام، اسلام اور مستشرقین، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۶ء، جلد ۲، ص ۴۸

(۴) اس سلسلہ میں پروفیسر ظفر علی قریشی کا مضمون مطالعہ ہے، دیکھئے: (ماہنامہ اسلامک لٹریچر، مدیر شیخ محمد اشرف، لاہور، جلد ۱۴، شمارہ ۴ تا ۱۰ مطابق اپریل تا اکتوبر ۱۹۶۸ء) بحوالہ مستشرقین اور مطالعہ سیرت، نقوش، رسول نمبر، ج۱۱

(۵) نثار احمد، ڈاکٹر، نقوش، رسول نمبر، ص ۴۹۷ (۶) الازہری، پیر محمد کرم شاہؒ، ضیاء النبی ﷺ، ج۶، ص ۳۳۱، ۳۳۲

(۷) حوالہ بالا، ص ۳۳۳

(۸) اصلاحی، ظفر الاسلام، قرآن کریم مغربی تہذیب کے لیے سب سے بڑا چیلنج، مغربی تہذیب کا چیلنج اور اسلام، مرتب پرواز رحمانی، منشورات، جولائی ۲۰۰۷ء (۹) سورۂ نجم، آیت ۱ تا ۱۷ (۱۰) محمد تقی، مفتی، آسان ترجمہ قرآن

(۱۱) سورۃ الحاقہ، آیت ۳۸ تا ۴۷ (۱۲) محمد تقی، مفتی، آسان ترجمہ قرآن (۱۳) سورۃ العنکبوت، آیت ۴۸

(۱۴) محمد تقی، مفتی، آسان ترجمہ قرآن کریم

(۱۵) الازہری، پیر محمد کرم شاہؒ، ضیاء النبی ﷺ، قرآن حکیم اور مستشرقین، ج۶، ص ۳۶۰

(۱۶) حوالہ بالا، ص ۳۶۱، ۳۶۲ (۱۷) حوالہ بالا، ص ۳۶۲، ۳۶۲ (۱۸) حوالہ بالا، ص ۳۶۵

(۱۹) ثناء اللہ ندوی، ڈاکٹر، علوم اسلامیہ اور مستشرقین، ص ۱۵۔۱۶، نشریات، لاہور، ۲۰۰۹ء

(۲۰) حوالہ بالا، ص ۲۰۔۲۱ (۲۱) حوالہ بالا، ص ۲۲

(۲۳) بدایونی، محمد اسماعیل، استشراقی فریب، اسلامک ریسرچ سوسائٹی، کراچی، جولائی ۲۰۰۹ء، ص ۹۰

(۲۴) رفیق زکریا، ڈاکٹر، محمد ﷺ اور قرآن، ص ۲۷، مشتاق بک کارنر، لاہور، (مترجم: ڈاکٹر مظہر محی ادین)

(۲۵) انور الجندی، (مترجم: عمیر الصدیق دربار بادی ندوی)، مستشرقین اور اسلام، اسلام اور مستشرقین دارالمصنفین اعظم گڑھ، جلد ۲، ۱۹۸۶ء، ص ۱۷۹

(۲۶) عثمانی، محمد تقی، علوم القرآن، مکتبہ دارالعلوم کراچی کورنگی، ماخوذ بتصرف